QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا اختصاص

DR. TABASSUM KASHMIRI'S HISTORIOGRAPHY SPECIALIZATION

Dr. Mubashir Hussain
Associate Professor, Govt. Associate College Phalia.
mubashirnike0@gmail.com
Dr. Azeemullah Jundran
Assistant Professor, Department of Urdu, Superior University, Faisalabad.

Abstract:
Dr. Tabassum Kashmiri stands as a transformative figure in the tradition of Urdu literary historiography. His monumental work, "History of Urdu Literature (From the Beginning to 1857)," marks a significant departure from traditional biographical-centric accounts toward a modern, scientific, and visionary framework. Influenced by the French Annales School, Kashmiri introduces the concept of "Total History," where literature is analyzed not in isolation but through an interdisciplinary lens encompassing sociology, economics, psychology, and mythology. This article explores the unique characteristics of Kashmiri's historiography, specifically his application of "History from Below," which prioritizes the socio-economic conditions of the common man over elite narratives. It further examines his psychoanalytical approach to classical poets, his objective deconstruction of prejudices against the Lucknow School (Dabistan-e-Lucknow), and his innovative use of visual historiography through maps and manuscripts. By blending rigorous research with a creative narrative style, Kashmiri elevates the writing of history to an "Art Form." This study highlights how his methodology provides a new visionary perspective, making him a unique and modern historian in the Urdu literary landscape.

Key words: *Tabassum Kashmiri, Urdu Literary Historiography, Annales School, Interdisciplinary Approach, Total History, History from Below, Dabistan-e-Lucknow, Psychoanalysis in Literature, Visual Historiography, Narrative Style, Urdu Adab ki Tareekh*

قوموں کے علمی، فکری اور تہذیبی تشخص کی بقا کا کلیدی دارومدار ان کی تاریخ نگاری کی ثروت مندی اور معروضیت پر ہوتا ہے۔ اردو میں ادبی تاریخ نویسی کی روایت اگرچہ تذکرہ نگاری کی قدیم بساط سے شروع ہوئی، جہاں شعرا کے حالات اور کلام کے عمومی تذکرے کو ہی تاریخ مان لیا جاتا تھا، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف میں اہم ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' سے شروع ہونے والا یہ سفر بیسویں صدی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی عالمانہ عرق ریزی تک پہنچ کر ایک ایسی مستحکم علمی روایت میں ڈھل گیا جہاں تحقیق اور تنقید کے باہمی اشتراک سے تاریخ کی تفہیم کی گئی۔ اسی تسلسل میں اکیسویں صدی کے آغاز پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی شاہکار تصنیف **"اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے 1857ء تک)"** ایک ایسی منفرد علمی جہت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی جس نے نہ صرف ماضی کی بازیافت کی بلکہ اردو میں ادبی تاریخ نگاری کے مروجہ پیمانوں کو جدید عالمی نظریات کی روشنی میں از سرِ نو ترتیب دے کر ایک نیا وژن فراہم کیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا سب سے اہم اور نمایاں اختصاص وہ جدید نظریاتی فریم ورک ہے جس کی بنیاد انہوں نے فرانس کے مشہور "اینلز دبستان" (Annales School) پر رکھی ہے۔ اردو میں ادبی تاریخ نگاری کی روایت طویل عرصے تک "تذکرہ نگاری" کے زیرِ اثر رہی، جہاں محض شعرا کے حالاتِ زندگی، سنین کی درستی اور کلام کے محاسن کے عمومی تذکرے کو ہی تاریخ مان لیا جاتا تھا۔ تبسم کاشمیری نے اس فرسودہ روش کو یکسر مسترد کرتے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ہوئے تاریخ نگاری کو ایک سائنٹیفک اور فکری عمل کے طور پر متعارف کرایا۔ اینلز دبستان کے زیر اثر ان کا موقف یہ ہے کہ تاریخ محض بڑے آدمیوں، بادشاہوں یا جنگوں کے وقائع کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ اس عہد کے اجتماعی شعور، تہذیبی رویوں اور انسانی نفسیات کے مطالعے کا نام ہے۔ انہوں نے ادب کو ایک الگ تھلگ جزیرے کے طور پر دیکھنے کے بجائے اسے زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ پیوست کر کے دیکھا ہے۔

تبسم کاشمیری کے ہاں تاریخ نگاری کا یہ جدید وژن "تاریخیت" (Historicity) کے اس تصور پر قائم ہے جہاں مورخ صرف ماضی کا ریکارڈ مرتب نہیں کرتا بلکہ وہ ماضی کے کرداروں کا ہم سفر بن کر ان کی ذہنی اور فکری دنیا کی بازیافت کرتا ہے۔ انہوں نے اینلز دبستان کی "ٹوٹل ہسٹری" (Total History) کی تکنیک کو اپنایا، جس میں کسی بھی ادبی تخلیق یا رجحان کی جڑیں اس عہد کے سیاسی انتشار، معاشی بحران اور سماجی ڈھانچوں میں تلاش کی جاتی ہیں۔ یہی وہ نظریاتی فریم ورک ہے جو ان کی تاریخ کو دیگر روایتی تاریخوں کے مقابلے میں ایک بصیرت افروز دستاویز بناتا ہے۔ ان کے نزدیک مورخ کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ بکھرے ہوئے حقائق کو ایک مخصوص نظریے کے تحت مرتب کر کے انہیں بامعنی بنادے، تاکہ تاریخ کے خاموش اور گم نام گوشے قاری کے لیے متحرک ہو جائیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری رقم طراز ہیں:

> "بیسویں صدی میں تاریخ کے تصورات میں انقلابی تبدیلیاں فرانس کے "ہنلز دبستان (Annales School) " سے شروع ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے ہنلز دبستان کے مورخین نے تاریخ کو اس محدود کلاسیکل تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر معنویت عطا کی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۹ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ و روپ سے سنوارا"۔(1)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے خود بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت مورخ محض خام مواد فراہم کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے وژن سے تاریخ کے غیر حاضر تصورات کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک تاریخ کو کسی خاص تھیوریٹیکل فریم ورک میں بیان نہ کیا جائے، وہ محض واقعات کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔ انہوں نے تاریخ کے اس سفر میں مورخ کے "متخیلہ (Imagination) " کو بھی کلیدی اہمیت دی ہے جو بے جان ماضی میں روح پھونک کر اسے حال کے مکالمے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس نظریاتی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ادبی تاریخ وہ ادب پارہ ہے کہ جسے کوئی ادبی مورخ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر قاری کے دیکھنے کے لیے اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ وہ تاریخ لکھنے سے پہلے تاریخ کا سفر کرتا، تاریخ کے کرداروں سے ملتا ہے۔"(2)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک روشن اختصاص "بین العلومیت" ہے، جس کے تحت انہوں نے اردو ادب کے مطالعے کو محض لسانی یا فنی حدود تک محدود رکھنے کے بجائے اسے عمرانیات، بشریات، اقتصادیات اور فلسفے جیسے متنوع علوم کے سنگم پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کوئی مجرد مظہر نہیں ہے جو خلا میں تخلیق ہوتا ہو، بلکہ یہ اپنے عہد کے جغرافیائی حالات، سیاسی کشمکش اور معاشی اتار چڑھاؤ کا زندہ ثمر ہوتا ہے۔ روایتی مؤرخین عموماً کسی شاعر کے کلام پر بحث کرتے ہوئے صرف اس کے اسلوب، زبان اور صنفی محاسن تک محدود رہتے تھے، لیکن ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "شعبہ جاتی مطالعات (Compartment Studies)" کے فرسودہ تصور کو رد کر کے یہ ثابت کیا کہ کسی بھی دور کے ادب کی تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس عہد کے مجموعی علمی و سماجی منظر نامے کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔

تبسم کاشمیری کا یہ بین العلومی منہج دراصل ادب کو ایک "تہذیبی اکائی" کے طور پر دیکھنے کی کوشش ہے۔ وہ جب کسی ادبی تحریک یا شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر وہ مابعد الطبیعیاتی اور دیومالائی عناصر بھی ہوتے ہیں جو اس عہد کے اجتماعی لاشعور کی تشکیل کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تاریخ، تحقیق اور تنقید کا ایسا آمیزہ ملتا ہے جہاں سماجی علوم کی روشنی ادبی متن کے تاریک گوشوں کو منور کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو پرکھتے ہوئے وہ محض اسے "عوامی رنگ" کہہ کر آگے نہیں بڑھتے، بلکہ اس عہد کے اقتصادی بحران اور نو آبادیاتی نظام کے منفی اثرات کے تحت پیدا ہونے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

والی "تاریخی جبریت" کا تجزیہ کرتے ہیں، جس نے انسان کو روٹی اور بھوک کے مسائل میں مقید کر دیا تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنے اس بین العلومی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے ایک شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ ہم اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس عہد کا تجزیہ مکمل کریں گے۔"(3)

ان کی اس تاریخ نگاری میں "بین العلومی مطالعات" محض ایک اصطلاح نہیں بلکہ ایک فعال تنقیدی ہتھیار کے طور پر ابھرتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ایک کامل ادبی مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کے تمام دھاروں پر نظر رکھتے ہوئے منزل کی طرف بڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجزیے یک رخے ہونے کے بجائے کثیر الجہاتی ہیں، جو قاری کو اس عہد کے باطنی فکر و عمل سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کے ہاں سماجی علوم اور تہذیب و ثقافت سے گہری واقفیت ہی وہ بنیادی عنصر ہے جو ان کے کام کو روایتی "واقعہ نگاری" سے بلند کر کے "ادبی تاریخ" کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ اس حوالے سے مقالہ نگار ذیشان وکیل لکھتے ہیں:

"ادبی مورخ سماجی علوم اور تہذیب و ثقافت سے گہری واقفیت رکھتا ہو گا تو ہی وہ کسی دور کے متعلق وژن پیدا کر سکے گا اور یہی وہ چیز ہے جو ادب کی تاریخ کو ادبی تاریخ بناتی ہے۔"(4)

یعنی ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بین العلومی مطالعات کے ذریعے اردو ادب کی تاریخ کو حقائق کے خشک روزنامچے سے نکال کر ایک بصیرت افروز علمی دستاویز میں بدل دیا ہے۔ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ادب کی روح کو سمجھنے کے لیے سیاست، مذہب اور معیشت کے تعامل کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ ان کا یہ منہج آنے والے دور کے مؤرخین کے لیے ایک ایسی مشعلِ راہ ہے جو ادب، سماج اور فکر کے باہمی رشتوں کی نئی تعبیرات پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک بے حد منفرد اور اچھوتا پہلو "نفسیاتی تجزیہ نگاری" ہے۔ انہوں نے اردو کے کلاسیکی شعرا کو محض مثالی کرداروں یا تاریخ کے مردہ ورق کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ ان کے تخلیقی سوتے ان کے "باطنی مرکز" (Inner Core) میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک ہر بڑا فنکار کسی نہ کسی نفسیاتی جبلت یا لاشعوری کیفیت کے زیرِ اثر فن پارے تخلیق کرتا ہے۔ تبسم کاشمیری نے ادبی مؤرخ کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ علمِ نفسیات اور تحلیلِ نفسی کے اصولوں کی مدد سے شاعر کے باطن میں جھانکے اور ان محرکات کا سراغ لگائے جو اس کی شاعری کے مزاج کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان کا یہ منہج اردو تاریخ نگاری میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہے، جہاں شخصیت کے نفسیاتی مطالعے سے فن پارے کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔

انہوں نے میر تقی میر کی ذہنی کشمکش اور ان کے عالمِ جنون کو سمجھنے کے لیے "خبط" (Obsession) اور "پیرانویا" (Paranoia) جیسی کلینکل اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک میر کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات نے ان کے تخیل کو ایک خاص نہج پر ڈال دیا تھا، جہاں وہ ایک "اجباری متخیلہ" کے حصار میں آ گئے تھے۔ اسی طرح انہوں نے مرزا محمد رفیع سودا کی ہجو نگاری اور تند و تیز لہجے کو محض ان کی بدمزاجی نہیں بلکہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی "انا" (Ego) "اور اس سے پیدا ہونے والی "سادیت پسندی (Sadism) "کا نتیجہ قرار دیا ہے، جہاں فنکار اپنے حریف کو لسانی اذیت دے کر اپنے اندرونی اضطراب کو تسکین پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری میر تقی میر کے نفسیاتی عارضے کی بابت رقم طراز ہیں:

"یہ خیال کہ چاند سے ایک خوبصورت خاتون کا پیکر اتر کر میؔر کی طرف آتا تھا، جس سے آخر شب تک صحبت رہتی تھی، میؔر کا خبط (Obsession) تھا۔ نفسیات کے مطابق یہ Paranoia کی صورت تھی۔ ایسی کیفیت میں ذہنی حالت کی تبدیلی یا خلل کے سبب مریض کے ذہن میں ایسے خیالات آتے ہیں۔ جو اس کے اپنے بس میں بالکل نہیں ہوتے۔"(5)

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

تبسم کاشمیری نے شعرا کے سماجی رویوں کو بھی ان کی نفسیاتی ساخت کے تناظر میں دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ میر درد کے حوالے سے ان کا تجزیہ بے حد بصیرت افروز ہے، جہاں وہ درد کے درویشانہ لبادے کو ایک "نقاب (Persona) " قرار دیتے ہیں، جس کے پیچھے ایک تڑپتا ہوا عاشق چھپا ہوا تھا جو تخلیقی عمل کے راستے نمودار ہو کر اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کر تا رہا۔ اسی طرح وہ قلی قطب شاہ کے کلام میں موجود گہرے جنسی رنگ کو بھی ایک نفسیاتی حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے ان کی پوری شعری کلیت کو ایک جمالیاتی رقص میں بدل دیا تھا۔ ان کے نزدیک جنس قلی قطب شاہ کا وہ بنیادی استعارہ ہے جس کی روشنی میں ان کی پوری کائناتِ فن گردش کرتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خادم حسین تبسم کاشمیری کی رائے نقل کرتے ہیں:

> "ہر بڑے شاعر کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسی پُراسرار طاقت ضرور ہوتی ہے جو اس کے تخلیقی سرچشموں کا منبع وما خذ ہوتی ہے۔۔۔ قلی قطب شاہ کی شاعری کا منبع وسر چشمہ جنس ہے۔ ہر انسان کا اپنا ایک باطنی مرکز ہوتا ہے اور وہ اس باطنی مرکز کی رہنمائی میں سفر حیات طے کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ کا باطنی مرکز جنس ہے۔"(6)

یہ نفسیاتی رسائی تبسم کاشمیری کو اردو کے دیگر روایتی مؤرخین سے ممتاز کر دیتی ہے۔ وہ شعرا کی بشری کمزوریوں، ان کے لاشعوری واہموں اور جبلی تقاضوں کو تاریخ کا حصہ بنا کر ان کے فن کے وہ معنی تلاش کرتے ہیں جو روایتی تنقید میں اکثر مخفی رہ جاتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ان نفسیاتی گتھلیوں کو سائنسی انداز میں سلجھاتے ہیں، جس سے تاریخ کے کردار محض ناموں اور تاریخوں کا مجموعہ رہنے کے بجائے گوشت پوست کے حامل زندہ انسانوں کے روپ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کی یہ بصیرت فنکار کے داخلی دکھ اور خارجی عمل کے درمیان ایک مربوط رشتہ قائم کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک عظیم کارنامہ دبستانِ لکھنؤ سے متعلق قائم شدہ روایتی تعصبات کی بیخ کنی اور اس کے علمی وقار کی بحالی ہے۔ اردو تنقید کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کو عموماً دبستانِ دہلی کے مقابلے میں پست، سوقیانہ اور محض جنسی تلذذ کا عکاس قرار دے کر مسترد کیا جاتا رہا ہے۔ تبسم کاشمیری نے اس رویے کو "تعصب کی دیوار" سے تعبیر کیا ہے، جس کی پہلی اینٹ ان کے بقول مولانا حالی نے اپنے 'مقدمہ شعر وشاعری' کے ذریعے رکھی تھی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ لکھنوی ادب کو دہلی کے مخصوص پیمانوں اور صوفیانہ داخلیت کے ترازو میں تولنا علمی بددیانتی ہے۔ ان کے نزدیک لکھنؤ ایک الگ تہذیبی اکائی تھی، جس کی اپنی سیاسی حرکیات، معاشی خوش حالی اور مذہبی روایت (اثنا عشری ثقافت) تھی، لہٰذا اس کا ادبی اظہار بھی دہلی سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔

تبسم کاشمیری نے لکھنوی شاعری کا معروضی جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جس خارجیت اور معاملہ بندی کو "اخلاقی پستی" کہا گیا، وہ دراصل اس عہد کے مادی اور مجلسی نشاط کا فطری تخلیقی رد عمل تھا۔ انہوں نے دبستانِ لکھنؤ کے دفاع میں ایک ایسا وژن فراہم کیا جو قاری کو اس تہذیب کی نفاست، شائستگی اور لسانی جراحی سے روشناس کراتا ہے۔ انہوں نے انشا، جرات اور رنگین جیسے شعرا کو ان کے عہد کے "تہذیبی باطن" کی علامت قرار دیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ تاریخ میں کسی بھی رجحان کو محض "مبتذل" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اسے انسانی معاشرت کے ارتقائی سفر کے ایک حصے کے طور پر سمجھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنوی ادب کے خلاف قائم دیوارِ ستم کی بابت رقم طراز ہیں:

> "ادب کی تاریخ میں لکھنؤ کی شاعری اور تہذیب کے خلاف تعصبات کی ایک دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ ہماری دانش گاہوں کے اساتذہ نے بھی اس دیوار کو پختہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ دبستان لکھنؤ کے خلاف تعصب کی پہلی اینٹ حالی کے مقدمۂ شعر وشاعری کی اشاعت سے رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ اینٹیں رکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور رفتہ رفتہ ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ جائزہ و ناجائز تعصبات کی یہ دیوار اب اتنی اونچی اور اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ اسے گرا کر حقیقت کا اصل رخ دیکھنا آسان نہیں ہے۔"(7)

تبسم کاشمیری کا یہ دفاع محض جذباتی نہیں بلکہ ٹھوس عمرانی حقائق پر مبنی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ لکھنؤ کی شاعری میں جنس اور بدن کی جزیات نگاری دراصل اس معاشرے کی "عشقیہ سائیکی" کا اظہار تھی، جہاں زندگی عیشِ امروز کی داستان بن چکی تھی۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جنہیں روایتی نقادوں نے دانستہ او جھل رکھا، جیسے ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک، میر حسن کی مثنوی نگاری میں تمثال سازی کا کمال اور انیس و دبیر کے مراثی میں

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

رزمیہ عناصر کی موجودگی۔ ان کے نزدیک لکھنؤ دہلی کی توسیعی شکل ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت میں ایک مکمل نظامِ فکر رکھتا تھا جس نے اردو زبان کو وہ بانکپن اور لسانی ثروت عطا کی جو دہلی کے حزن وملال میں ممکن نہ تھی۔ اس معروضی مطالعے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ لکھتی ہیں:

> "ڈاکٹر تبسم کاشمیری قطعاً دلی کے شعری معیارات کی بنیاد پر دبستان لکھنؤ کی شاعری کو جانچنے یا پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اُنھوں نے اس شاعری کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کے لیے اسی تہذیب و معاشرت (جسے وہ عورت کی تہذیب کہتے ہیں) سے ہی اخذ کیے ہیں، جس میں یہ شاعری تخلیق ہوئی تھی۔ یوں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پہلی بار لکھنوی داتسبان کی شاعری کو اُس کے درست تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے"۔(8)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اس تحقیقی مساعی سے دبستانِ لکھنؤ پر لگے یک طرفہ الزامات کی گرد چھٹ گئی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ لکھنؤ کی "نا شاعری" کے دور میں بھی مصحفی اور آتش جیسے شعرا خالص شاعری کا علم بلند کیے ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ نگاری نے ثابت کیا کہ جب تک ہم کسی خطے کے معاشی نظام اور سیاسی انفعالیت کو نہیں سمجھیں گے، ہم اس کے ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔ یوں انہوں نے لکھنوی دبستان کو اردو ادب کے مرکزی دھارے میں وہ مقام دلایا جس کا وہ تاریخی طور پر حق دار تھا۔ ان کا یہ منہج اردو ادب کے قارئین کو ایک نئی بصارت فراہم کرتا ہے جس میں دہلی اور لکھنؤ دو متصادم دھڑے نہیں بلکہ ایک ہی دریا کے دو مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک بے حد اہم اور انقلابی اختصاص "نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ (History from Below) "کی تکنیک کا استعمال ہے۔ اردو میں ادبی تاریخ نگاری کی روایت عموماً "اوپر سے لکھی گئی تاریخ" رہی ہے، جس میں شاہانِ وقت، امرا، رؤسا اور دربار سے وابستہ قد آور شخصیات کے کارناموں کو ہی کلیدِ اول سمجھا جاتا تھا۔ تبسم کاشمیری نے اس اشرافیہ پسندانہ طرزِ فکر کو رد کرتے ہوئے اپنی توجہ اس "عام آدمی" پر مرکوز کی جو تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کے پیچ کچلا جاتا رہا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کی اصل روح ان گمنام چہروں اور عام طبقوں کے دکھ سکھ، معاشی بدحالی اور نفسیاتی شکست وریخت میں پوشیدہ ہے جنہیں روایتی مؤرخین نے اکثر نظر انداز کیا۔

انہوں نے اٹھارویں صدی کے پر آشوب دور کا مطالعہ کرتے ہوئے مغلوں کے زوال کو محض ایک سلطنت کے خاتمے کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اسے ایک اجتماعی تہذیبی المیے کے طور پر پیش کیا جس نے عام ہندوستانی کی زندگی کو بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بنا دیا تھا۔ جب وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر کرتے ہیں، تو ان کا مرکزِ نگاہ مغلوں کی عسکری شکست نہیں ہوتی، بلکہ وہ پنجاب اور دلی کے ان باسیوں کی تباہی کا نوحہ لکھتے ہیں جن کے معاشی اثاثے چھین لیے گئے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری ایک سماجی وانسانی دستاویز بن جاتی ہے، جو عام ذہنوں میں پیدا ہونے والی مایوسی اور "خوابوں سے محرومی" کا گہرا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اس حوالے سے مقالہ نگار اظہر علی سید رقم طراز ہیں:

> "وہ "نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ" کی تکنیک کے مطابق نہ تو مغل خاندان کا......نہ اُن کی بادشاہت یا اس سلطنت کے امرا اور روسا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور نہ وہ ہی فوج کی شکست کے حالات دکھاتے ہیں، بلکہ وہ عام آدمی کی معاشی، معاشرتی بدحالی اور ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی کیفیات اور احساسات کو پیش کرتے ہیں جن سے عام آدمی دوچار ہوا اس طرح معاشرے کے عمومی حالات کا نقشہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔"(9)

تبسم کاشمیری نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو اسی اختصاص کی بنیاد پر "عوامی روایت" کا شاہکار قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک نظیر کا "آدمی" کوئی آدرشی یا خیالی وجود نہیں ہے بلکہ وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا وہ گوشت پوست کا انسان ہے جو تاریخ کی جبریت اور شدید معاشی بحران کا شکار تھا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ نظیر کی شاعری اس "مبتلائے زر" معاشرے کی داستان ہے جہاں سرمایہ دارانہ انحطاط نے انسانی قدروں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ یہی وہ "نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ" ہے جہاں ایک مؤرخ بڑے ناموں کے پیچھے چھپے ہوئے سماجی انتشار اور عوامی کرب کی آواز کو دریافت کرتا ہے۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اٹھارویں صدی کے سماجی زوال کے نفسیاتی اثرات کی بابت لکھتے ہیں:

"ابدالی کے اس المناک منفی کردار کے باعث عام ذہنوں میں بے بسی، لاچارگی اور شکست کی طاقتوں نے مزید غلبہ پایا۔ ستم یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ کے بعد کوئی خواب دیکھنے والا دانش ور بھی باقی نہ رہا اور جو معاشرہ خواب سے بھی محروم ہو جائے اس کی موت پر یقین کر لینا چاہیے۔"(10)

یعنی ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اردو ادب کی تاریخ کو ملوکیت کے حصار سے نکال کر عوامی زندگی کے سنگم پر لا کھڑا کیا ہے۔ انہوں نے یہ باور کرایا ہے کہ اصل تاریخ وہ نہیں جو محلات میں رقم ہوتی ہے، بلکہ اصل تاریخ وہ ہے جو گلی کوچوں، بازاروں اور عام آدمی کے شکستہ دلوں میں سانس لیتی ہے۔ ان کا یہ منہج اردو تاریخ نگاری میں ایک نئی سماجی بصیرت پیدا کرتا ہے، جہاں ادب کو ایک ایسی زندہ قوت کے طور پر دیکھا گیا ہے جو معاشرے کے پسماندہ طبقوں کی آواز بن کر تاریخ کے اوراق میں امر ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک بے حد دلکش اور منفرد وصف ان کا "داستانی اسلوب" اور "تخلیقی نثر" ہے۔ عام طور پر تاریخ کی کتابیں خشک حقائق، سنین کی بھرمار اور بوجھل علمی اصطلاحات کے باعث عام قاری کے لیے گراں گزرتی ہیں، لیکن تبسم کاشمیری نے اس جمود کو توڑتے ہوئے ادبی تاریخ کو ایک ایسے پیراہے میں ڈھالا ہے جو ناول اور داستان کے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک مورخ کا کام محض معلومات بہم پہنچانا نہیں ہے، بلکہ اسے تاریخ کے کرداروں میں روح پھونک کر انہیں متحرک کرنا چاہیے۔ انہوں نے تاریخ نگاری کو محض ایک 'کرافٹ' (Craft) سمجھنے کے بجائے اسے ایک 'آرٹ فارم' (Art Form) کا درجہ دیا ہے، جہاں الفاظ کا تخلیقی استعمال ماضی کے گرد آلود چہروں کو دوبارہ زندہ اور تابناک بنا دیتا ہے۔

تبسم کاشمیری نے اس داستانی رنگ کو شعوری طور پر اپنایا، جس کا ایک سبب جاپان میں اردو تدریس کے دوران طلبہ کی دلچسپی برقرار رکھنا تھا۔ انہوں نے "فلیش بیک" اور "منظر نگاری" جیسی فکشن کی تکنیکوں کو بروئے کار لا کر تاریخ کے اہم واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ جب دلی کی تباہی، شعرا کی ہجرت یا شاہی درباروں کے زوال کا نقشہ کھینچتے ہیں تو قاری خود کو اس عہد کی مجلسوں کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کی نثر میں وہ روانی اور شگفتگی موجود ہے جو تحقیق کی خشکی کو زائل کر کے ایک فن پارے کا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ وہ شعرا کے حلیے، لباس اور چال ڈھال کا ذکر اس جزئیات نگاری سے کرتے ہیں کہ ان کے "قلمی مرقعے" آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کی تصویر مکمل کر دیتے ہیں۔

تبسم کاشمیری کی اس تخلیقی نثر کا بہترین نمونہ وہ مقامات ہیں جہاں وہ تاریخی المیوں کو بیان کرتے ہوئے اپنے تخیل کی بلندی سے ایک ایسا منظر تخلیق کرتے ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالے جانے کا واقعہ ہو یا میر تقی میر کی دلی سے ہجرت کا منظر، ان کی تحریر میں ایک ایسی تڑپ اور بصری قوت موجود ہے جو روایتی مورخین کے ہاں مفقود ہے۔ وہ "صاحب بصیرت مورخ" کی تعریف پر پورا اترتے ہوئے تاریخ کے خاموش اور غیر حاضر تصورات کو اپنی وژنری طاقت سے سامنے لاتے ہیں۔ ان کا یہ اندازِ بیان نہ صرف معلومات کی منتقلی کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ قاری کو اس عہد کے باطنی کرب اور تہذیبی مزاج سے جذباتی طور پر بھی ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ تبسم کاشمیری کی اسلوب نگاری کی ایک جھلک ان کی کتاب کے اس اقتباس سے دیکھی جا سکتی ہے:

"9 اگست 1788ء کو دلی کے لال قلعہ میں مغل شہزادوں اور شہزادیوں میں ایک کہرام برپا تھا۔ 'ہائے شاہ عالم! ہائے شاہ عالم!!' کی پُر درد صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نوکِ خنجر سے نکالی جا چکی تھیں اور وہ فرش پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مدد کے لیے فریاد کر رہا تھا۔"(11)

یعنی ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی جادو نگار نثر کے ذریعے اردو ادب کی تاریخ کو ایک نیا فنی وقار عطا کیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ادبی تاریخ نگاری محض خشک معلومات کا انبار نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جس میں مورخ کا متخیلہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا داستانی اسلوب قاری اور تاریخ کے درمیان حائل صدیوں کی مسافت کو مٹا دیتا ہے اور اردو ادب کے سفر کو ایک جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتا ہے۔ ان کی یہ تخلیقی نثر مستقبل کے مؤرخین کے لیے اسلوب اور بیان کے نئے معیار مقرر کرتی ہے جہاں تحقیق کی سچائی اور ادب کی دلکشی ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر نظر آتی ہیں۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک اور منفرد اور جدید اختصاص "بصری مواد" کا علمی استعمال ہے، جس نے اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے روایتی تصور کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ اردو کی بیشتر ادبی تاریخیں محض متن اور بیانیہ تک محدود رہی ہیں، جہاں جغرافیائی حدود اور تاریخی مقامات کا ذکر تو ملتا ہے مگر ان کی کوئی واضح بصری نقشہ گری موجود نہیں ہوتی۔ تبسم کاشمیری نے پہلی بار اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ادب کے طالب علم اور قاری کے لیے زبان کے سفر اور ریاستوں کے عروج و زوال کو سمجھنے کے لیے "جغرافیائی تناظر" ناگزیر ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ میں مختلف ادوار کے نقشے شامل کر کے تاریخ کو ایک تجریدی تصور سے نکال کر ایک مادی اور بصری حقیقت میں بدل دیا ہے۔

ان نقشہ جات کی شمولیت سے قاری کو یہ سمجھنے میں بے حد آسانی ہو جاتی ہے کہ قطب الدین ایبک کی فتح دہلی کے بعد لسانی نقل و حرکت کا رخ کیا تھا یا ریاست اودھ کی حدود 1801ء کے بعد کن علاقوں تک محیط تھیں۔ انہوں نے محمد بن تغلق کی سلطنت، بہمنی ریاست، بیجاپور، گولکنڈہ اور ریاستِ اودھ کے حدودِ اربعہ کو نقشوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ یہ بصری معاونت قاری کے تخیل کو مہمیز دیتی ہے اور اسے یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ محض الفاظ کا مطالعہ نہیں کر رہا بلکہ اس سرزمین کا سفر کر رہا ہے جہاں یہ ادب تخلیق ہوا۔ اس طرح، لکھنؤ اور دہلی کے درمیان فاصلہ یا دکن کے مختلف مراکز کی جغرافیائی اہمیت محض اعداد و شمار نہیں رہتے بلکہ ایک جیتی جاگتی تصویر بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اس حوالے سے مقالہ نگار ذیشان وکیل لکھتے ہیں:

> "اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک)" کی ایک اور اہم خوبی مختلف ریاستوں مثلاً ۱۳۴۳ء میں محمد بن تغلق کی سلطنت، ۱۵۶۴ء میں ریاست دکن، بہمنی سلطنت ۱۵۳۸ء، ۱۷۳۷ء اور ریاست اودھ کی جغرافیائی حدود ۱۸۰۱ء کے بعد کے نقشہ جات ہیں۔۔۔ لہٰذا ادب کا قاری محض تجریدی انداز میں تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں کرتا بلکہ اسے تاریخ کا سفر کرنے اور اسے دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔"(12)

نقشہ جات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے قدیم مخطوطات کی تصاویر، تاریخی عمارات اور اہم شخصیات کے مرقعوں کو بھی اس تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اور نصرتی کی "گلشنِ عشق" کے قلمی نسخوں کے اوراق کے عکس شامل کیے ہیں، جن سے نہ صرف اس عہد کے رسم الخط کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ قاری کا رشتہ براہِ راست اصل ماخذات سے جڑ جاتا ہے۔ یہ "بصری شہادتیں" تاریخ کے استناد کو مضبوط کرتی ہیں اور مؤرخ کی محنت اور علمی تبحر کی گواہی دیتی ہیں۔ تصاویر اور نقشوں کا یہ امتزاج خشک تاریخی مباحث میں ایک ایسا حسن اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے جو قاری کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ انیس ناگی نے اس بصری اختصاص کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "ان کا اہم تحقیقی کارنامہ اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ہے۔۔۔ انھوں نے دکنی ادب کے قدیم دکنی متون کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ قدیم بادشاہوں، شہروں کے نقشے اور مخطوطوں کی تصاویر بھی فراہم کی ہیں۔ مختلف ادبی ادوار کے خصائص کا تعین کرتے ہوئے انھوں نے تاریخی اور معاشرتی تاریخ کے امتزاج سے ہر عہد کے تخلیقی محرکات کا بھی جائزہ لیا ہے۔"(13)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ بصری طریقہ کار دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو ایک "ٹوٹل ڈسکورس" (Total Discourse) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ نقشہ جات کی مدد سے جغرافیائی حدود کا تعین اور تصاویر کے ذریعے ثقافتی مظاہر کی پیش کش، قاری کے ذہن میں ایک مکمل "عہد" کی تصویر کشی کر دیتی ہے۔ یہ اختصاص ان کی تاریخ کو محض ایک درسی کتاب کے درجے سے بلند کر کے ایک ایسی شاہکار دستاویز بنا دیتا ہے جو بصارت اور بصیرت دونوں کو یکساں طور پر سیراب کرتی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ایک جدید مؤرخ کے لیے قلم کے ساتھ ساتھ نقشہ نگاری اور بصری جمالیات کا شعور بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عرق ریزی اور تحقیقی جستجو۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا ایک نہایت ارفع اختصاص تاریخ کو محض ایک میکانیکی عمل یا حقائق کی جمع آوری کے بجائے ایک "آرٹ فارم" (Art Form) کے درجے تک پہنچانا ہے۔ ان کے نزدیک ادبی تاریخ نگاری محض ایک علمی ہنر یا کرافٹ نہیں ہے بلکہ یہ مؤرخ کی خلاقانہ صلاحیتوں کا وہ شاہکار ہے جہاں تحقیق کی خشکی، تخیل کی آمیزش سے ایک جمالیاتی تجربے میں بدل جاتی ہے۔ تبسم کاشمیری نے اس تصور کو عام کیا ہے کہ جس طرح ایک

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

سرجن محض جراحی نہیں کرتا بلکہ اپنی مہارت سے اسے فن بنادیتا ہے، اسی طرح ایک بڑا مورخ بھی ماضی کے بکھرے ہوئے اور بے جان واقعات کو اپنے وژن کے ذریعے ایک ایسی اکائی میں ڈھال دیتا ہے جو اپنے اندر ایک فنی کشش رکھتی ہے۔ ان کا یہ اسلوب اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے روایتی ڈھانچے کو توڑ کر اسے تخلیقی نثر کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتا ہے۔

تبسم کاشمیری کے ہاں "صاحب بصیرت مؤرخ" کا تصور کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق ایک عام مؤرخ اور ایک وژنری مؤرخ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وژنری مؤرخ تاریخ کے ان گوشوں اور تصورات کو بھی دیکھ لیتا ہے جو بظاہر تاریخ کے منظر نامے سے غائب یا مخفی ہوتے ہیں۔ وہ حقائق کو محض خام مواد سمجھتے ہیں اور اس خام مواد میں اپنے وژن سے رنگ بھر کر تاریخ نگاری کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ ان کی بصیرت تاریخ کے "غیر حاضر" تصورات کو "حاضر" کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، جس کے نتیجے میں قاری محض گزرے ہوئے واقعات کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ اس عہد کے باطنی شعور اور عصری حساسیت سے براہِ راست ہم کلام ہوتا ہے۔ یہی وہ وژن ہے جو ان کی تاریخ کو دیگر روایتی تواریخ سے ممتاز اور وقیع بناتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میرے نزدیک ایک اچھی ادبی تاریخ وہی ہے جو آرٹ فارم تک جا پہنچتی ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ کچھ سرجن تو جراحی کرتے ہیں مگر چند سرجن جراحی کو آرٹ بنا دیتے ہیں۔ ادبی تاریخ کو آرٹ فارم بنا دینا اور جراحی کو آرٹ فارم بنانے میں جس چیز کا دخل ہے وہ کسی فرد کی مخصوص فنی صلاحیت کا مظاہرہ ہے"۔(14)

تبسم کاشمیری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو صرف معلومات کا ذخیرہ بننے سے بچایا ہے اور اسے ایک مربوط معنی عطا کیا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک مؤرخ کے پاس ایک وسیع وژن نہیں ہوگا، وہ بکھرے ہوئے مواد کو بامعنی پیرائے میں ترتیب نہیں دے سکے گا۔ ان کی تاریخ نگاری میں سیاسی تاریخ کی دھڑکنیں اور معاشرتی زندگی کے مرقعے جس متحرک انداز میں سامنے آتے ہیں، وہ ان کے ہمہ گیر علمی مرتبے اور تاریخی شعور کا ثمر ہے۔ وہ تاریخ کے تاریک اور گم نام گوشوں کو اپنی ذہنی بصیرت سے روشن کرتے ہیں، جس سے وہ چیزیں جو پہلے غیر محسوس تھیں، قاری کے لیے واضح اور محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ان کا یہ صاحبِ بصیرت انداز اردو ادب کی تاریخ کو ایک ایسی داستان بنا دیتا ہے جس کا تسلسل اور معنویت قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ اس اختصاص کی بابت ڈاکٹر محمد خاور نوازش رقم طراز ہیں:

> "ادبی مورخ جب تاریخ لکھتا ہے تو وہ ہر دور کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی تاریخ کی تعبیر کرنے کے ساتھ ساتھ ادب کی تحسین اور تجزیہ کا کام بھی کرتا ہے۔۔۔ صاحب بصیرت ادبی مورخ اپنے وژن کی مدد سے تاریخ کے غیر حاضر، یا نظر نہ آنے والے تصورات کو اپنی وژنری طاقت سے سامنے لاتا ہے یہی خوبی اس کا طرۂ امتیاز بنتی ہے۔"(15)

مجموعی طور پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اردو ادب کی تاریخ کو مروجہ "تذکرہ نمائی" سے بلند کر کے ایک باقاعدہ ڈسکورس اور آرٹ فارم کی حیثیت عطا کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ایک بہترین تاریخ وہی ہے جو نہ صرف ماضی کی بازیافت کرے بلکہ اپنے عہد کے لیے ایک نیا فکری وژن بھی مہیا کرے۔ ان کی یہ تحقیقی و تخلیقی مساعی مستقبل کے مؤرخین کے لیے ایک ایسا معیار مقرر کرتی ہے جہاں علمی تبحر اور فنی جمالیات ایک دوسرے کے ساتھ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ اختصاص ہے جو انہیں دورِ حاضر کا ایک منفرد اور عہد ساز ادبی مؤرخ بناتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نگاری کا عمیق مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے اردو میں ادبی تاریخ نویسی کو محض ایک مشینی دستاویزی عمل (Mechanical Process) کے بجائے ایک زندہ تخلیقی تجربے اور مربوط فکری نظام میں بدل دیا ہے۔ ان کی تاریخ کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب ادب کو سماج، سیاست، نفسیات اور معیشت سے کاٹ کر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ انہوں نے اینلز دبستان کے زیرِ اثر اردو ادب کی "ٹوٹل ہسٹری" مرتب کی، جس میں پہلی بار ملوکیت کے بجائے "عام آدمی" اور اس کے معاشی و ذہنی کرب کو جگہ ملی۔ ان کی تحقیقی مساعی سے دبستانِ لکھنؤ پر لگے یک طرفہ تعصبات کے پردے چاک ہوئے اور تاریخ نگاری میں نقشوں اور تصاویر کے بصری استعمال نے اسے ایک جدید سائنٹیفک بنیاد عطا کی۔ تبسم کاشمیری نے یہ ثابت کر دیا کہ

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ایک کامیاب مؤرخ وہی ہے جو ماضی کے خاموش واقعات کو اپنے وژن اور متخیلہ کے ذریعے حال کے مکالمے کا حصہ بنا کر اسے ایک "آرٹ فارم" کا درجہ دے دے۔

سفارشات:

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے اس عظیم علمی کام کی اہمیت کے پیشِ نظر درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1. ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ تاریخ فی الوقت 1857ء تک کے ادب کا احاطہ کرتی ہے؛ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسی وژن اور بین العلومی منہج کے تحت 1857ء سے دورِ حاضر تک کی تاریخ پر کام کو ترجیحی بنیادوں پر مکمل کیا جائے تاکہ اردو ادب کا ارتقائی تسلسل واضح ہو سکے۔
2. جامعات کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر "ادبی تاریخ نگاری" کے نصاب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مخصوص نظریاتی فریم ورک (اینلز دبستان اور بین العلومی مطالعہ) کو بطور خاص شامل کیا جائے تاکہ نئے محققین جدید تاریخ نویسی کے اصولوں سے واقف ہو سکیں۔
3. مستقبل کے ادبی مؤرخین کے لیے لازم ہے کہ وہ محض شعرا کے سوانحی خاکوں پر اکتفا کرنے کے بجائے تبسم کاشمیری کے "نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ" کے اسلوب کو اپنائیں، جس میں عوامی زندگی اور معاشی حالات کو کلیدی اہمیت دی گئی ہے۔
4. اردو کی دیگر ادبی تواریخ کو بھی ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نقشہ نگاری اور بصری معاونت والے اختصاص سے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ جغرافیائی اور لسانی نقل و حرکت کو سمجھنے میں قارئین کو سہولت میسر آ سکے۔
5. ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے پیش کردہ مخصوص نفسیاتی تجزیوں (مثلاً میر کا خبط یا قلی قطب شاہ کی جنسی جبلت) پر الگ سے علمی سیمینارز اور مباحثے منعقد کرائے جائیں تاکہ ان کی پیش کردہ نئی تعبیرات کی مزید علمی پرتیں کھل سکیں۔

حوالہ جات

1. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۹
2. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اوصاف (سنڈے میگزین)، لاہور، ۲۵ نومبر ۲۰۰۷ء، ص۱۰
3. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء، ص9
4. ذیشان وکیل، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک) از ڈاکٹر تبسم کاشمیری: بین العلومی تناظر میں، مشمولہ: بازیافت، شمارہ 39، جولائی تا دسمبر 2021ء، ص160
5. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء، ص316
6. خادم حسین، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نویسی اور ادبی تاریخ کے نئے تصورات، مشمولہ: سہ ماہی بازیافت، شمارہ 35، جولائی تا دسمبر 2019ء، ص 88
7. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک)، ص397
8. طاہرہ صدیقہ، ڈاکٹر، تبسم کاشمیری بطور ادبی تاریخ نویس، مشمولہ: ماخذ تحقیقی مجلہ، شمارہ اپریل تا جون 2022ء، ص40
9. اظہر علی سید، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ کا تکنیکی مطالعہ، شمارہ 7، جنوری تا جون 2012ء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص295
10. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک)، ص254
11. ایضاً، ص663

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

12. ذیشان وکیل، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے 1857ء تک) از ڈاکٹر تبسم کاشمیری: بین العلومی تناظر میں، مشمولہ: بازیافت، شمارہ 39، جولائی تا دسمبر 2021ء، ص170
13. انیس ناگی، پاکستانی اردو ادب کی تاریخ، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۳۷۹
14. تبسم کاشمیری، "اردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی گئی؟ مشمولہ: "ادبی تاریخ نویسی"، مرتبین: ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص۱۷۹
15. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ: تخلیقی ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، جنوری 2008ء، شمارہ نمبر 5، ص11

References

1. Tabsum Kashmiri, Dr., *Urdu Adab Ki Tareekh*, M.R. Publications, New Delhi, 2006, p. 9.
2. Tabsum Kashmiri, Dr., *Ausaaf* (Sunday Magazine), Lahore, 25 November 2007, p. 10.
3. Tabsum Kashmiri, Dr., *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak)*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003, p. 9.
4. Zeeshan Wakeel, *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak) az Dr. Tabsum Kashmiri: Bain-ul-Uloomi Tanazur Mein*, mashmoola: *Baazyaft*, Shumara 39, July–December 2021, p. 160.
5. Tabsum Kashmiri, Dr., *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak)*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003, p. 316.
6. Khadim Hussain, Dr., *Dr. Tabsum Kashmiri Ki Tareekh Nawaisi aur Adabi Tareekh Ke Naye Tasawwuraat*, mashmoola: *Sih Maahi Baazyaft*, Shumara 35, July–December 2019, p. 88.
7. Tabsum Kashmiri, Dr., *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak)*, p. 397.
8. Tahira Siddiqa, Dr., *Tabsum Kashmiri Bator Adabi Tareekh Navees*, mashmoola: *Maakhaz Tahqeeqi Mujalla*, Shumara April–June 2022, p. 40.
9. Azhar Ali Syed, Dr., *Dr. Tabsum Kashmiri Ki Urdu Adab Ki Tareekh Ka Technical Mutala'a*, Shumara 7, January–June 2012, International Islamic University, Islamabad, p. 295.
10. Tabsum Kashmiri, Dr., *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak)*, p. 254.
11. Ibid., p. 663.
12. Zeeshan Wakeel, *Urdu Adab Ki Tareekh (Ibtidaa se 1857 tak) az Dr. Tabsum Kashmiri: Bain-ul-Uloomi Tanazur Mein*, mashmoola: *Baazyaft*, Shumara 39, July–December 2021, p. 170.
13. Anis Nagi, *Pakistani Urdu Adab Ki Tareekh*, Jamaliyat, Lahore, 2002, p. 379.
14. Tabsum Kashmiri, "*Urdu Adab Ki Tareekh Kaise Likhi Gayi?*", mashmoola: *Adabi Tareekh Nawaisi*, murattibeen: Dr. Syed Aamir Suhail, Naseem Abbas Ahmed, Lahore: Pakistan Writers Cooperative Society, 2010, p. 179.
15. Tabsum Kashmiri, Dr., *Adabi Tareekh Ki Tashkeel-e-Nau Ke Masail*, mashmoola: *Takhleeqi Adab*, National University of Modern Languages, Islamabad, January 2008, Shumara No. 5, p. 11.